مولانا عزیزالحسن صدیقی غازی پوری

بارھوی صدیں کی تجدیدی شخصیت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ

دارالسلطنت دہلی سے ۲۵ کلومیٹر دور ایک تاریخی قصبہ پھلت سے مظفر نگر میں ۴شوال ۱۱۱۴ھ بروز چہار شنبہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ آپکی ولادت کے وقت آپ کے والد مکرم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی عمر ۲۰ سال تھی۔ اس عظیم فرزند کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو بہت سے مبشرات نظر آئے تھے۔ شاہ ولی اللہ جب پانچ سال کے ہوئے تو مکتب میں داخل کرادیئے گئے۔ سات سال کی عمر میں آپ نے قرآن پاک حفظ کرلیا اور پندرہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرلی اور اس عمر میں اپنے والد مکرم سے مشکوٰۃ شریف کا درس حاصل کرلیا۔ شاہ عبدالرحیم اپنے بیٹے ولی اللہ کے شفیق باپ ہی نہیں، استاد و مربی اور مرشد بھی تھے، خود شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بچپن کے دور میں ایک دن اپنے ہمجولیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ باغ کی سیر کو چلا گیا اور جب واپس آیا تو والد محترم نے فرمایا۔ ولی اللہ تم نے اس دن رات میں وہ کیا چیز حاصل کی جو باقی رہے؟ ہم نے تو اتنی مدت میں اتنا درود پڑھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرا دل سیر و تفریح سے بالکل سرد ہوگیا اور اس کے بعد پھر کبھی اس کا شوق نہیں ہوا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب مجھے حکمت، آداب مجلس اور تہذیب و دانشمندی کی باتیں سکھاتے تھے اور ہدایت فرمایا کرتے کہ جو لوگ مرتبے میں کم ہوں ان سے ہمیشہ سلام میں سبقت کرنا اور خوش اخلاقی سے پیش آنا ان کی خیریت اور احوال دریافت کرنا یہ بھی فرماتے کہ بعض لوگ کسی خاص پوشاک کے عادی ہوجاتے ہیں، کوئی تکیہ کلام مقرر کرلیتے ہیں بعض کھانوں سے متنفر ہوجاتے ہیں ان سب چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اپنی کسی خواہش کی تکمیل میں صرف لذت مقصود نہ ہو۔ بلکہ اس میں کسی ضرورت کی تکمیل، کسی فضیلت کا حصول یا ادائے سنت مقصود ہونی چاہیے۔ چال ڈھال نشست و برخاست کسی چیز سے بھی ضعف و کسلمندی کا اظہار نہیں ہونا چاہیے بقول شاہ ولی اللہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ شجاعت، فراست و خوش انتظامی اور غیرت کے اوصاف عالیہ سے متصف تھے اور اکل معاش بھی اکل معاد کی طرح کامل ووافر رکھتے تھے کاش کہ ہمارے اس دور کے علماء طلباء بھی ایسے ہی ہوتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو آج علما و ناصحین کی طرح اسٹیج کے شیر نہ تھے بلکہ وہ سٹیج پر بھی منفرد ہوا کرتے تھے اور معرکہ حق و باطل میں سر دھڑ کی بازی بھی لگانا جانتے تھے شاہ صاحب نے چودہ سال کی عمر میں اپنے والد مکرم سے بیعت کی اور اشغال میں منہمک ہوگئے۔ ان کی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور ایک سال تک وہاں کا قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سفر میں انہوں نے علم حدیث کا مطالعہ کیا اور تکمیل کی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس سفر و قیام کے دوران فن حدیث کی تکمیل کو انکے تجدید و اصلاح کے ایوان بلند میں حجرالزاویہ corner Stone بتایا ہے۔

شاہ صاحب کا عہد:

یقیناً ایک پر آشوب عہد تھا اس وقت پورا عالم اسلام انقلاب کے گھمورے میں جھولائے تھا ہندوستان سینکڑوں سال سے وسط ایشیائی قوموں کی جولان گاہ اور سیاسی طور سے ان کے زیر اثر رہ چکا تھا۔ اسی عہد میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر کئی حملے کئے اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو پچھاڑ کر تاریخ کو نیا رخ اور سلطنت مغلیہ کو سہارا دیا۔

شاہ صاحب کے زمانہ شعور و آگہی میں سلطنت عثمانیہ میں کئی سلاطین تخت اقتدار کے مالک بنے اور ہٹائے بھی گئے۔ حجاز بھی اس زمانے میں اتحل پستحل کا شکار رہا۔ ایران کی حالت بھی ایک بیمار کی سی تھی۔ یہی نہیں کہ سیاسی طور سے یہ ممالک پستی کی طرف جا رہے تھے بلکہ علمی و دینی اعتبار سے بھی یہ رو بہ زوال تھے، خصوصیت کے ساتھ ایران جس کی خاک سے بلند پایہ فقہاو محدثین اٹھے شیعی غلبہ و تسلط نے اسکو ایک شیعہ مملکت کی حیثیت دی اور سنی مذہب کو وہاں سے نیست و نابود کر دیا گیا، نہ صرف ایران بلکہ عراق و ترکستان ہر جگہ فلسفہ و ریاضی کا دور دورہ تھا، ہندوستان بھی سیاسی و انتظامی اعتبار سے انحطاط پذیر تھا اور خصوصیت کے ساتھ مسلم سوسائٹی پوری طرح قعر مذلت میں پڑی تھی سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پر تھا مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقرا اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزارات پر چراغ جلائے بیٹھے تھے مدرسوں کا گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پر شور تھا فقہ وفتاویٰ کی لفظی پر ستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا بڑا جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکامات وارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے (مقالات سلیمانی ص ۴۴)" شاہ صاحب کو جو زمانہ ملا ایسا تھا کہ بادشاہ سے فقیر اور تاجر سے صنعت کار تک سب کے سب بگڑے ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بادشاہ یا وزیر، فوجی سپاہی ہوں یا تاجر و صناع علماء و مشائخ ہوں یا ان کے جانشین اولادیں، واعظان کرام ہوں یا تارک الدنیا زاہد، ایک ایک کی خبر اور پوری سوسائٹی کا تعاقب کیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک نیچے سے اوپر تک اصلاح نہیں ہو گی اور مشین کا ہر پرزہ درست نہ ہو گا لیپا پوتی سے کام چلنے والا نہیں ہے۔ آپ نے اپنے سفر حج (۱۷۳۱ء) سے واپسی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فلاح اسی میں ہے کہ دور حاضر کے تمام نظاموں کی دھجیاں بکھیر دی جائیں اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے "فک کل نظام" کا نصب العین پیش کرنے کے بعد ایک دم سے تلوار ہاتھ میں نہیں اٹھالی۔ بلکہ پہلے اپنے نظریات کی تعلیم و تلقین کی اور تربیتی مراکز قائم کیے اور "تپے تپائے" افراد کو منتخب کر کے کام سپرد کیا یہ الگ بات ہے کہ آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور آپ کے مشن کی تکمیل کے بلند فکر اور بلند حوصلہ صاحب زادے حضرت عبدالعزیز اور دوسرے پسماندگان مریدین و مسترشدین اور تلامذہ کے حصہ میں

آئی۔

یقیناً شاہ صاحب کے پاس موجودہ دور کی نشر و اشاعت اور پریس کی طاقت نہ تھی، آج ہمارے اداروں اور جماعتوں کے پاس سرمایہ کی جو بہتات ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی ان کے پاس نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علوم اور ان کے افکار و نظریات پر مشتمل ہزاروں صفحات ان کے انتقال کے ڈیڑھ سو سال بعد دنیا کے سامنے آسکے۔

"کیپٹل" کے مصنف کال مارکس سے ایک صدی قبل شاہ ولی اللہ نے محنت و سرمایہ کی کشمکش کا حل تجویز کیا تھا اور اقتصادیات و سیاسیات کے جو بنیادی اصول پیش کئے تھے، ان کی اشاعت اگر ان کے عہد میں ہی ہوئی ہوتی تو شاید کال مارکس، انیگلیس اور ان جیسے دوسروں کے چراغ جل بھی نہ پاتے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ آپ نے دولت کی اصل بنیاد محنت کو قرار دیا، کھیت مزدور کے حقوق کو محفوظ کیا، امداد باہمی (موجودہ کوآپریٹو تحریک کے مماثل) کو شہریت کی روح بتایا، جوا، سٹہ بازی اور عیاشی کے اڈوں کو ختم کرنے پر زور دیا اور کہا کہ جب تک یہ بیماریاں ختم نہیں ہونگی، دولت کی تقسیم کا صحیح نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ مزدور کو ملک کی دولت کا اصل مستحق گردانا۔ یہ بھی فرمایا کہ جو سماج محنت کشوں کو پوری اجرت نہ دے اور مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے۔ وہ سماج قوم دشمن ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ کہ شاہ صاحب کا زمانہ پرشور انقلابات کا زمانہ تھا، جنگ و جدل جاری تھا، حکومتوں کا ردو بدل اور الٹ پھیر روزانہ کا معمول تھا، پوری زندگی انسانی سوسائٹی کرپٹ ہو چکی تھی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے علوم و افکار پرسکون دریا کی طرح بہہ رہے تھے، آپ کے ذہن و فکر اور سوچ کے دھارے بالکل پرسکون تھے۔ آپ کے دل میں اسلام کا درد بھی تھا، مسلم حکومتوں کے زوال سے آپ فکر مند بھی تھے۔ آپ کی نگاہیں پوری دنیا کے نقشے پر مرکوز تھیں، آپ کو وطن عزیز کی بربادی پر بھی تشویش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی عظیم اصلاحی جدوجہد کا آغاز کر دیا اور اپنی بات بے غل و غش حکومت اور عوام تک پہنچائی۔ دنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ جب کسی مرد حق آگاہ نے سچی بات منہ سے نکالی ہے تو اس کو اس کی سزا ضرور دی گئی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوا۔ آپ پر قاتلانہ حملے تک کئے گئے۔

سیاسیات اور نظام حکومت کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

(۱) زمین کا حقیقی مالک اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے۔ ملکیت کا مطلب ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسروں کی دخل اندازی ممنوع ہو۔

(۲) سارے انسان برابر ہیں کسی کو حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ ملک، مالکِ قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرلے۔

(۳) اسٹیٹ کے سربراہ کی وہی حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے

ضمن میں فرماتے ہیں۔

(۱) روٹی، کپڑا، اور مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر کے بلالحاظ مذہب و نسل ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۲) مذہب رنگ یا نسل کے فرق کے بغیر باشندگان ملک کے معاملات یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت، ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔ (شاندار ماضی جلد دوم۔ صفحہ ۸۔ ۹)

(۳) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے۔ (شاندار ماضی جلد دوم صفحہ ۸۔ ۹)

"ان حقوق کو حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے قائم کئے جائیں، یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ان کا ایک بلاک ہوگا جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ اس کا یہ بھی فرض ہوگا کہ کسی مخصوص قوم یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے۔ اس کا یہ بھی فرض ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم یا مذہب یا تہذیب پر حملہ کر سکے۔" (شاندار ماضی جلد دوم)

مذہبیات کے تحت شاہ صاحب صفائی کے ساتھ کہتے ہیں۔

(۱) داعیان صداقت ہر قوم اور ملک میں گزرے ہیں۔ ان کا احترام ضروری ہے۔

(۲) سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں۔ البتہ اختلاف عمل کی صورت میں ہے۔

(۳) ساری مہذب دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشاء و مقصد ایک ہے اور آخری بات یہ فرماتے ہیں۔ کہ:۔ جہاد ایک مقدس فرض ہے مگر اس کے یہ معنی ہیں کہ مقدس اصول کے لئے انسان اپنے اندر جذبہ فدائیت پیدا کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی ان اصولوں کے لئے فنا کر دے۔ (شاندار ماضی جلد دوم)

طوالت کا خوف دامن گیر ہے اس لئے ہم بات کو مختصر کر کے مطلب کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۱۷۶۲ء میں ہو گیا اور ان کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ ان کے جانشین بنائے گئے۔ جنہوں نے والد بزرگوار کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں ہندوستان کا کوئی علمی حلقہ ایسا نہ تھا۔ جس کا تعلق شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مرکز سے نہ ہو۔

مولانا سید محمد میاں "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں لکھتے ہیں۔

"فک کل نظام" کے ہمہ گیر انقلاب کا تصور جو شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تک چند دماغوں کی مخصوص امانت تھی شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کے وقت ملک کا عام جذبہ بن چکا تھا۔ ہزاروں نوجوان اس کے لئے زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ اور ان کی صدائے بازگشت ہندوستان سے گزر کر ایشیاء کے دور دراز

ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔

یہی شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہوں نے ۱۸۳۰ء میں جب "ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ اعلان سنا کہ "زمین خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔" تو اس کے خلاف جامع مسجد دہلی سے آواز بلند کی۔ "آج سے یہ ملک دارالحرب "ہو گیا۔ ان غاصبوں کے خلاف جہاد کرنا ہمارا فریضہ ہے۔"

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کیا تھے۔ صاعقہ آسمانی تھے۔ جس نے انگریزی اقتدار کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا یہ دراصل شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دل کی پکار تھی۔ یہ پکار پورے ملک میں سنی گئی اور سر بکف مجاہدین کے قافلے آگے بڑھنے لگے۔ ۸۵ سال تک ولی اللہ دہلوی کے جانشین علماء نے اس ملک میں جہاد بالسیف کیا، کھوئے ہوئے اسلامی اقتدار کو واپس لانے کی کوششیں کیں۔ آج چاہے کوئی کچھ کہدے اور جو دعوے چاہے کرے لیکن تاریخ تاریخ ہی ہے۔ اس ملک کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے، اور اس کو گہوارہ امن بنانے کے لئے، انسانوں کو شرف انسانیت واپس دلانے کے لئے، مساوات، بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے، ملک میں خوشحالی لانے کے لئے علماء حق نے جو منظم کوششیں کیں۔ ان کے مقابلے میں دوسری کوئی تحریک پیش کرنا ناممکن ہے۔ ۸۵ سال کے اندر علماء کی چار تحریکات سامنے آئیں۔

پہلی تحریک:۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی زیر قیادت، جس کے سلسلے میں دونوں بزرگوں نے سکھ ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ شہادت پائی۔

دوسری تحریک:۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت، جس کو انگریزی حکومت نے "غدر" کا نام دیا، حالانکہ وہ جہاد حریت تھا۔

تیسری تحریک:۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد علماء صادق پور کی قیادت میں اٹھی۔ جو عرصہ تک جاری رہ کر ۱۸۸۶ء میں انبالہ کے مشہور مقدمہ پر ختم ہوئی۔

چوتھی تحریک:۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی زیر قیادت "ریشمی رومال تحریک" کے نام سے مشہور ہے۔ جس نے ۱۹۱۹ء میں شیخ الہند کی ہدایت کے مطابق عدم تشدد اور ہندو مسلم اشتراک کے ذریعہ حصول آزادی کی جدوجہد کی شکل اختیار کی۔

دیوبند تحریک مجلس احرار، خلافت کانفرنس، جمعیت علماء ہند یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ اور عبدالعزیز نے ڈالی تھی۔ آج ہندوستان ان ہی کے صدقے و طفیل میں آزاد کھڑا نظر آتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان بزرگوں کا مشن پورا ہو گیا؟ اگر نہیں ہوا تو کیا اس کے لئے ہم نے کوئی منصوبہ تیار کیا ہے؟ شاہ صاحب نے جس آئیڈیل اسٹیٹ کا تصور پیش کیا تھا کیا اس کو موجودہ جمہوری حکومت پورا کرتی ہے؟ بلاشبہ ملک تقسیم ہو کر آزاد ہوا اور ہندوستان میں آزاد حکومت جو سوشلسٹ طرز کا سماج قائم رکھنے کی دعویدار ہے موجود ہے۔ مگر کیا کوئی یہ بھی دعویٰ کر سکتا ہے کہ ملک سے کرپشن،

لاقانونیت اور سامراج ختم ہو گیا، کیا بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلی کو نگلنا چھوڑ دیا ہے۔ زبان کے جھگڑے کیا مٹ گئے۔ کیا تہذیبی اور کلچرل اکائیوں کو ہضم کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی ہیں۔ اگر ہماری سوسائٹی میں یہ سارے امراض ابھی تک پائے جاتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان کو دور کرنے کے لئے کون لوگ سامنے آئیں گے۔ کیا شاہ صاحب کی انقلابی دعوت و تحریک سے خود کو جوڑنے والے ان عنوانات پر غور فکر کریں گے؟ شاہ صاحب نے اپنے پیش کردہ نظام کے لئے جہاد کو لازم قرار دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ ان اصولوں کے لئے اپنی ہستی کو فنا کردو تو کیا ہم نے ایسا کوئی ارادہ کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو اس کے کتنے درجے اور ادوار مقرر کئے ہیں، اور یہ بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت ہم کس درجے میں ہیں اور آئندہ کا منصوبہ اور نقشہ کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں کم از کم ہندوستانی سوسائٹی کو ایک پیام ایسا دے سکتے ہیں۔ جو اس دور ابتلاء میں اس کو راحت کی چند سانسیں لینے کا موقع فراہم کر سکے۔ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ مسلم معاشرہ کو رسم و رواج، فضول خرچی، دکھاوے سے بچا کر سچی اسلامی زندگی گزارنے کی تلقین کریں۔ مسلمانوں کے اندر سے جہالت کو دور کریں، ان کے دلوں میں خدا کا خوف راستبازی و پاکبازی کے جذبات پیدا کریں، خدمت خلق، نوع انسانی کی فلاح و بہبود اور مظلوموں کی غمخواری کا داعیہ پیدا کریں، سادہ زندگی گزارنے پر زور دیں، نوجوانوں میں محنت اور جفاکشی کا جذبہ پیدا کریں۔

کیا ہمارے موجودہ علماء اس پر غور کریں گے کہ حضرت شاہ صاحب کے نظریات کی بناء پر ایک ایسا مینڈیٹ (منشور) تیار کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ جس کے ذریعہ موجودہ زوال پذیر ہندوستانی معاشرے (جس کا ایک جزو ہم بھی ہیں) کو سنبھالا اور سدھارا جاسکے؟ اگر وہ ایسا کر سکے تو اس ملک پر، اس ملک کے بسنے والوں پر ان کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ شاہ صاحب کے عہد میں ہمارے مدارس اور خانقاہوں کا جو حال ہو گیا تھا۔ کیا آج وہی حال ان کا نہیں ہے؟ اگر ہے تو ان کے سدھار کی کوشش کب شروع کی جائے گی؟

شاہ صاحب نے اپنے وضع کردہ بنیادی اصولوں میں اسٹیٹ کی جو ذمہ داری بیان کی ہے۔ کیا اس کی توضیح کے لئے ہم نے کوئی اسکیم تیار کی۔ کیا ہم نے اس ملک کے عوام اور خواص کو تعلیم یافتہ طبقہ کو، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کو بتایا کہ آزادیٔ ہند سے بہت پہلے جبکہ اس ملک میں سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمارہا تھا اور انگریز کے قدم ابھی جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک عظیم مفکر شاہ ولی اللہ دہلوی نے ہندوستان کے مخصوص تمدنی و تہذیبی حالات کے مطابق ایک ایسا نظام مرتب کیا۔ جس میں اقلیت و اکثریت سب کے تحفظ کو ملحوظ رکھا گیا تھا اور بقاء باہم۔۔۔۔۔ (Co-EXISTENCE) کا اصول پیش کیا گیا تھا۔

(بشکریہ: ماہنامہ "دینی مدارس" دہلی جنوری ۱۹۸۹ء)